شیخ ایاز کی تخلیقیت اور فکر، قومی تناظر میں

ڈاکٹر انوار احمد*

Abstract

Thought and creativity of Sindhi Pashto, Baluchi, Punjabi and Saraiki intellectuals and writers need a second reading and thought to suspend 'historic fallacy' owned by 'Urdu walas.'

اس میں شک نہیں کہ پاکستانی جامعات میں رنگ' روغن کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے، عملی ذہانت رکھنے والے اساتذہ کے لیے گنگا خطرناک حد تک قریب ہو کر بہہ رہی ہے اور اگر وہ قومی معاملات سے بے تعلق یا بے فکر رہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ایسے سافٹ وئیر میں تبدیل ہونے دیں جو بھلے اور یجنل کی ایک ہزارویں کاپی ہوں۔ مگر مہذب سرمایہ کار اشرافیہ کے بنائے نظام میں اس طرح فٹ ہو جائیں کہ زبان' کلچر' قومیت' تاریخی شعور یا نو آبادیاتی ذہن کی کرشمہ سازیوں پر غور و فکر کو اپنے شعور یا ضمیر کا حصہ بنا کر موجودہ تاجروں کی دانست میں وائرس کا شکار نہ ہو جائیں تو پھر ان کی موقعہ پرستی کے رتبے بلند ہوتے رہیں گے۔

پاکستان میں ۱۹۸۶ء کے بعد ایک نئے معاہدۂ عمرانی کی بات شروع ہوئی تھی' بعض خوش خیالوں نے یہ سوچے بغیر کہ یہاں روسو یا والٹیر نہیں' شریف الدین پیرزادہ اور ورلڈ بینک کے مقامی کارندے رہتے ہیں' جن کے نزدیک اس نئے معاہدے کے تحت ریاست کو تعلیم' صحت اور امن عامہ جیسے دردسر سے نجات دلانا تھا' چنانچہ تینوں شعبوں کو پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی گئی، یہ اعلان کیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم ہر پاکستانی کا حق نہیں، نہ علاج معالجے کی سہولت فراہم کرنا اور اس کے جان و مال کے تحفظ کا فرض ریاست پر قبضہ کرنے والوں کے ذمہ ہے، بلکہ جو مطلوبہ مالی وسائل رکھتا ہے، وہ اپنے لیے اعلیٰ تعلیم، مناسب ہسپتال یا تجربہ کار معالج اور ایک یا ایک سے زائد گن مین کی خدمات بازار سے حاصل کرے، سو، پاکستان کے دریاؤں کی طرح اعلیٰ تعلیم کے سرچشموں کا بھی

* صدر شعبۂ اُردو، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اورینٹل لرنگز، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد۔

سودا کیا گیا' کوشش کی جا رہی ہے کہ دانش گاہوں کی قیادت فکری طور پر اس درسگاہ کے اساتذہ، طالبعلموں اور خطے کے لوگوں کے لئے فیض رساں نہ ہو، رفتہ رفتہ تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی ملکی برآمدات میں شامل ہو، چونکہ کم وسیلہ لوگوں کی جانب سے ہی سوال اُٹھائے جاتے ہیں،

اس لیے جامعات کے دروازے ان پر بند ہو جائیں، صاحبان نے مرزا سے ملنے کی تمنا میں جس گڈ گورننس کی تمنا کی تھی' وہی ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا مطمح نظر ہے:

گلیاں ہوون سُنجیاں تے وچ مرزا یار پھرے

اور یہ سب کچھ اس وقت منطقی انجام کو پہنچے گا' جب پبلک یونیورسٹیوں کے وسیع وعریض کیمپس پرائیویٹ سیکٹر کو الاٹ کیے جائیں گے' Humanities کے شعبے بند ہو جائیں گے، جامعات اپنے خطے اور قومی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے محروم اور سائنسی شعور سے کوسوں دور ہوں گی اور کوئی آواز بلند نہیں ہوگی کہ جامعات کی فکری آزادی، داخلی خودمختاری کہاں جاتی رہی اور سربراہِ ادارہ کی شخصیت اور فکر میں تخلیقیت یا تازہ کاری کے کتنے ممکنات ہیں؟ ایسے میں شیخ ایاز یاد آتے ہیں' جو اپنے نقطۂ نظر اور تخلیقی شعور اور اس کے لئے برداشت کی جانے والی صعوبتوں کے باعث پاکستانی معاشرے میں ضمیر کا درجہ رکھتے تھے، جنہیں پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا، اس سے پہلے کہ میں اسے پاکستانی جامعات کی فکری تاریخ کا ایک روشن باب کہوں، آپ ذرا رک کر' اس بارے میں سندھ کے دو بڑے دانشوروں' اور سابقہ وائس چانسلروں کا نقطہ نظر سن لیجئے:

''شاید کچھ احباب مجھ سے اتفاق نہ کریں لیکن میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شہرت' ان کی عظمت اور سندھ میں ان کی شخصیت کی مقبولیت ختم کرنے کے لیے ان کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ یہ سب کچھ انہیں کی رضامندی سے ہی ہوا لیکن سندھ کے نوجوانوں' ادیبوں اور قوم پرستوں نے شیخ ایاز کے اس فیصلے کو ناپسند کیا۔ ان پر سخت تنقید کی' بلکہ شیخ صاحب کو تنہا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی زندگی میں سندھ میں ہی مقبولیت پھر ہرگز حاصل نہ کر سکے جو ان کو وائس چانسلر بننے سے

پہلے حاصل تھی۔''

(ڈاکٹر غلام علی الانا، ''شیخ ایاز ایک قومی اور عوامی شاعر'' ادبیات، اسلام آباد، جلد: ۱۲، شمارہ: ۴۷، بہار: ۱۹۹۹، صفحہ نمبر ۱۷۸)

چلئے ڈاکٹر جی الانا تو عملی ذہانت رکھنے والے ایک افسر اور منتظم کی شہرت رکھتے ہیں، دوسری رائے تو امر جلیل جیسے تخلیق کار کی ہے، جو نہ صرف متصوفانہ مزاج رکھتے ہیں، مگر ایک جلالی صوفی کی طرح قومی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایسا موقف رکھتے ہیں، جو ابھی بھی باوردی ہئیت حاکمہ کو تسلیم نہیں ہوگا۔

''طبعی طور پر شیخ ایاز ہر قسم کی آمریت کے خلاف تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو شیخ ایاز کے ساتھ کسی قسم کی چپقلش نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے شیخ ایاز کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کر دیا۔ ایاز نہ تو ماہر تعلیم تھے اور نہ ہی ان کو کسی طرح سے بھی کوئی منتظم اعلیٰ کہا جا سکتا تھا۔ ان کا میلان طبع تو فطری طور پر شاعری کی طرف تھا وہ انگریزی۔ سندھی۔ اُردو۔ ہندی اور فارسی زبانوں کے کلاسیکی ادب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ چنانچہ جلد ہی یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے ساتھ ان کے اختلافات منظر عام پر آنا شروع ہو گئے۔ ایاز نے جتنے سال بھی یونیورسٹی میں گزارے ان برسوں میں ان کے ''امیج'' کو کافی دھچکا لگا۔ نتیجتاً وہ ایک انتہائی غمگیں اور تنہا شخص ہو کر رہ گئے اور پھر کچھ عرصے کے بعد بالکل ہی گم نامی کی حالت میں رہے۔''

(امر جلیل/ آصف زمان انصاری، ''بعینہٖ'' ادبیات جلد: ۱۲، شمارہ: ۴۷، بہار ۱۹۹۹ء، صفحہ نمبر ۱۷۴)

یہی نہیں، ڈاکٹر مبارک علی جیسے روشن خیال دانشور نے اپنی آپ بیتی 'در در ٹھوکر کھائے' [فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء] میں بھی ان کے بارے میں کافی ناہمدردانہ ریمارکس دیئے ہیں، اپنی معطّلی، پھر معافی طلبی اور آخر کار ضیاء الحق کے زمانے میں ان کی ایک اور معیادِ عہدہ کے حوالے سے آرزومندی کے حوالے سے۔ [چھٹا باب، سندھ یونیورسٹی اور لاہور] خود شیخ ایاز نے بھی اپنی آپ بیتی 'دنیا ساری خواب' [ترجمہ اسلم رحیل مرزا۔ الفاظ، لاہور، ۱۹۹۸ء

میں اعتراف کیا ہے کہ مجھے ماحول کی تبدیلی کی ضرورت تھی ۔۔۔اس لئے میں نے یہ ملازمت قبول کر لی' [ص ۹۱،] اس منصب پر ان کے فائز ہونے پر ان سے فکری اور شخصی اختلافات رکھنے والوں نے بلاشبہ انہیں نہ صرف ناپسند کیا ہوگا، بلکہ مبالغے کے ساتھ ان کے بعض معمولات کی ایسی تصویر کشی بھی کی ہوگی ،جس کے مطابق وہ کوتاہ نظروں کو ایک ابنارمل فرد نظر آئیں، یہاں مجھے Lionel Trilling کی کتاب The Liberal Imagination میں شامل ان کا مضمون Art & Neurosis یاد آرہا ہے۔ جب وہ تخلیقی فنکار کی دیوانگی کی بات کرتا ہے تو سوال کرتا ہے کہ ادیب کو ابنارمل کہنے والے پہلے نارمل کے لفظ کے معنی تو متعین کریں پھر وہ ایک صنعتی معاشرے کے نارمل یا کامیاب آدمی کا نقشہ کھینچتا ہے اور بین السطور یہ بات سمجھاتا ہے کہ ایسے عبرت ناک نارمل لوگوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ہی کوئی معاشرہ تخلیقی فنکاروں کا محتاج ہوتا ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ جب کوئی فنکار اور دانشور اپنی دھرتی کے ضمیر کا درجہ اختیار کرتا ہے' اس کے الفاظ' اقوال کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں اور معاشرے کی کمزوروں اور لہجے حسنِ عقیدت اور والہانہ پیار سے اسے اپنی توقعات اور آرزؤں کا مرکز بنا کر اسے منصور یا سرمد کے قبیلے میں شامل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں' ہم اپنے ہیرو کی باقی ماندہ زندگی پر قابض ہو کر چاہتے ہیں کہ اس کی موت ہمارے ہاتھوں نہیں تو ہماری مرضی کے مطابق ہو' اس لیے کہ ذرا سی بشری کمزوری ہمارے ہیرو کو ہماری تیار کردہ سولی کا پھندا چومنے سے باز رکھے گی۔ شیخ ایاز نے ساہیوال جیل کی ڈائری میں ایک بڑا اعلیٰ فکری تبصرہ اس صورتِ حال پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، ''شہادت کا موضوع میرا مرغوب موضوعِ مطالعہ رہا ہے' میں اکثر شہادت سے سے قبل شہید کی ذہنی کش مکش کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔'' (ص ۳۴) شیخ ایاز کو قومی اور فکری تحریکوں میں شہید کے فیض رساں کردار کا احساس ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو تخلیق کار حاکموں کا قرب یا التفات حاصل کرتا ہے، محروموں کے ازلی پیار سے محروم ہو جاتا ہے، وہ خود لکھتا ہے کہ بھٹائی نے نور محمد کلہوڑو کی مٹھائی دریا میں پھینک دی تھی، [ساہیوال جیل کی ڈائری، ص ۱۰۱] حسن' کتاب اور لفظ سے محبت کرنے والے شیخ ایاز کا ایک ہی محبوب ہے اور وہ سندھ' جو پاک دھرتی کا نام بھی ہے' تاریخ' تہذیب طرزِ احساس اور اسلوب زیست بھی' اسے اسلام اور حب وطن کے نام پر مٹانے یا گھٹانے کی جو کوششیں ہوئیں' اور خاص طور پر ون یونٹ بنانے والوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ مغربی پاکستان ہے کیا، وادی سندھ اور آپ پاکستان کے نقشے سے سندھ نام کے صوبے کو مٹا رہے ہیں؟ ظاہر ہے اس صورتِ حال کے خلاف تخلیقی دنیا میں سب سے معتبر آواز شیخ ایاز کی تھی، اسی طرح آج ضرورت ہے کم از کم پاکستانی جامعات کے تاریخ اور ادبیات کے شعبوں میں اس کام کی، کہ پاکستانی ہیئتِ حاکمہ نے قومی تاریخ میں جن

دانشوروں اور تخلیق کاروں کو زیرِ تعزیر و عقوبت رکھا' ان کا جرم کیا تھا،انتظار حسین یا کوئی مہاجر ادیب ہجرت کو مرکزی تخلیقی تجربہ قرار دے،اور میرٹھ،دلی یا لکھنو کے اپنے غیر مسلم سنگی ساتھیوں کو یاد کرے تو یہ نظریہ پاکستان کے عین مطابق ہو،اور اگر شیخ ایاز قیامِ پاکستان کے وقت سندھ سے نقل مکانی کرنے والے اپنے ہندو دوستوں کو یاد کرے تو وطن دشمن اور اسلام دشمن کہلائے؟

اسی طرح اردو زبان سے اس کا ایک سچے تخلیق کار کی طرح محبت کا رشتہ ہے،مگر سندھ میں اردو کو سیاسی اور ثقافتی برتری کے حربے کے طور پر استعمال کرنے والوں سے وہ الجھتا ہے اور ایسے عالم میں وہ اردو زبان سے وابستہ تہذیب کو درباروں اور طوائفوں کی مرہونِ منت قرار دیتا ہے اور وقتی طور پر بھول جاتا ہے کہ تخلیقی اظہار کے وسیلے کے لئے اس نے پہلے پہل اردو کو ہی منتخب کیا تھا،دوسرے شاید اسے ابھی اردو زبان کے بیشتر سیاسی نکتہ چینوں کی طرح معلوم نہیں تھا کہ اس زبان کے ابتدائی شاعروں میں جعفر زٹلی بھی تھا،جس نے فرخ سیر[۱۶۸۳۔۱۷۱۹] کے لئے کہے گئے اس مسکوک شعر[سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر۔۔بادشاہِ بحر و بر فرخ سیر] کی پیروڈی اس طرح کی تھی،

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ تسمہ کش، فرخ سیر

(زٹل نامہ،ص ۱۵)

اور فرخ سیر نے اس جرات مند شاعر کے کہے کے عین مطابق اسے اسی طرح ۱۷۱۳ء میں ہلاک کرایا تھا۔[مقالاتِ شیرانی،جلد نہم،ص ۳۰۸]

حالانکہ اس زبان کے بڑے تخلیق کاروں سے اس کا رشتہ محبت آمیز ہے،اب غالب کی ہی مثال لے لیجئے،سنٹرل جیل سکھر میں جب وہ مئی ۱۹۷۱ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک نظر بند تھے،تو انہوں نے اپنی نوٹ بک میں ایک اندراج یہ بھی کیا،''اقتدار کے آباؤ واجداد کفنائے گئے ہیں،اور ان کے کفن بھی تار تار ہو چکے ہیں،لیکن ادب اور آرٹ کو حیاتِ جاوید ملی ہے،انگریز برِ صغیر سے بھاگ گئے،لیکن غالب ابھی تک زندہ ہے''۔[شاعر کی نوٹ بک سے[ترجمہ اسلم جاوید]'فکرِ ایاز'ترتیب آصف فرخی،شاہ محمد پیرزادہ۔دانیال،کراچی،۲۰۰۶ء،ص ۱۰۶]اسی غالب کے بارے میں جب وہ سندھی میں نظم لکھتا ہے'غالب کے مزار پر'تو وہ اسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد کہتا ہے:

مگر ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے طاقت کے سامنے سر کس طرح جھکایا تھا؟

شاعر

عظیم شاعر

تم نے یہ کیسے بھلا دیا

کہ سارا اقتدار کفِ خاکستر ہے،

تمام دولت رنگ کا قفس ہے،

فقط نالہء نارسا ہی تمہاری نجات ہے!

تم نے یہ کیسے بھلا دیا

کہ ہر جابر

سب سے زیادہ

شاعر سے ڈرتا ہے

میرے لئے دعا کرو، غالب

کہ جب تک میرے ہاتھ قلم کئے جائیں

تب تک میرا قلم

ظلم وستم کی ہر قوت سے

تمہاری ذلت کا انتقام

لیتا رہے۔ [ترجمہ، بشیر عنوان۔ادبیات، اسلام آباد، شمارہ ۴۷، ص، ۲۵۰، ۲۵۱]

کیونکہ شیخ ایاز کا موقف ہے ''قصیدہ گو چاہے انقلاب کے ہی کیوں نہ ہوں شاعر نہیں ہوتے'' ['ساہیوال جیل کی ڈائری' ترجمہ کرن سنگھ۔دانیال، کراچی، ۲۰۰۶، ص ۹۲] اسی طرح بلاشبہ انہیں احساس ہے کہ فارسی اور عربی سے بہت زیادہ جڑنے کی تمنا میں اردو زبان اپنی ارضیت سے محروم بھی ہوئی ہے۔وہ لکھتے ہیں: کل رات امیر خسرو کی ایجاد بہار راگنی کے یہ بول 'کلین سنگ کرت رنگ رلین' سن کر سوچ رہا تھا کہ اردو والوں نے کیا گنوایا ہے، کیا پایا ہے، کیا وہ فیاض خان کے یہ بول 'باجو بند کھل جائے' یا 'کاہے کو جھوٹی بناؤ بتیاں' یا اسد علی خان کا نٹ بھاگ کا خیال 'جھنن جھنن پائل باجے' اور جے جے ونتی کا خیال 'لاگے نین مورے پیا کے دوارے' یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ بول

پاکستانی اردو میں نہیں ہیں' کیا وہ سوامی ہری داس' بیجو باورا اور تان سین کو اس لئے دھتکار دیں گے، کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔'' [شاعر کی نوٹ بک سے، 'فکرِ ایاز' ص۹۲،۹۳] اردو کے طالب علموں اور استادوں اور اگر ہو سکے تو اس زبان کے نادان دوستوں کو بھی شیخ ایاز کی اس تنقید کو بغور پڑھنا چاہیئے اور اس تمنا، یا دعا پر بھی توجہ دینی چاہیئے: اردو رابطے کی زبان ہے، وہ قلعہ معلیٰ میں پیدا ہوئی تھی' اس کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم ہوئی، [اور اب] اردو ہی لوگوں کے تقسیم شدہ دلوں کو جوڑ سکتی ہے۔ [ساہیوال جیل کی ڈائری، ص،۱۱] اسی طرح ایسے لوگوں کو شیخ ایاز کی منظومات پر بھی توجہ دینی چاہیئے، جن میں وہ اردو کی ادبی روایت کے بارے میں اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں، جیسے ان کی ایک نثری نظم دیکھئے؛

'مجاز کی طرح جوانی میں موت
ہونٹوں پر ایک پیغمبرانہ گیت
اور شکست خوردہ تبسم
یہ موت اتنی مشکل نہیں ہے
مشکل تو یگانہ چنگیزی کی موت ہے
پیری
بیماری
بے چارگی
اور عبدالماجد دریابادی کے چہرے پر
فاتحانہ تبسم!

[ٹکڑے ٹوٹی صلیب کے، ترجمہ آصف فرخی، شاہ محمد پیرزادہ، 'فکرِ ایاز' ص۲۲۲]

سو، وہ جس فردِ جرم پر کبھی شہر بدر ہوا، کبھی جیل میں ڈالا گیا، ہمیشہ فتوؤں کی زد میں لایا گیا، اسے اب نصف صدی کے بعد اس فردِ جرم کے مصنفین بھی پڑھیں تو شاید شرمندہ ہوں، یہ اور بات ہے کہ اب احساس ہوتا ہے کہ قومی سطح پر ایسی فرد جرم کو کھوکھلا کرنے میں شیخ ایاز جیسے دانشوروں اور تخلیق کاروں کی مزاحمت کا جو حصہ ہے، اسے پاکستان کی نئی نسل فراموش نہیں کر سکتی'۔ اگرچہ ابھی بھی عبدالماجد دریابادی کے ہونٹوں پر زہریلا تبسم کھیل رہا ہے 'انگارے' ملتان کے جواں سال مدیر سجاد انصاری کی کتاب 'محشرِ خیال' کو مرتب کرنے پر جس طرح حکومتِ پنجاب

کے محکمہ تعلیم نے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔اس پر پتہ نہیں کیوں مجھے یہاں 'ساہیوال جیل کی ڈائری' میں سے شیخ ایاز کا ایک تخلیقی جملہ یاد آ رہا ہے: ''لالٹین، ساری رات جلی ہے۔اسکا آدھا شیشہ کالا ہو گیا ہے اور باقی آدھے سے کچھ روشنی جال میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔'' [ص۱۵۴]۔شیخ ایاز نے پاکستانی اشتراکیوں کے بارے میں ایک مرتبہ لکھا تھا: ''مذہب سے نفرت ہی یہاں کے کچھ لوگوں کو اشتراکیت کی طرف کھینچتی ہے، کیونکہ انہیں روحانی نجات کا اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔۔۔میں نے یہاں ایک بھی اشتراکی ایسا نہیں دیکھا، جس کو اشتراکیت سے رغبت، مذہب سے نفرت کی وجہ سے نہ ہو۔'' [سندر بن سے خط، [ترجمہ، کرن سنگھ] 'فکرِ ایاز'، ص۶۹]

بہر طور آج شیخ ایاز، اجمل خٹک، گل خان نصیر، فیض عابد عمیق اور عاشق بزدار جیسے تخلیق کاروں اور ان کی فکری مزاحمت اور تازہ کار تخلیقیت کو جامعات کی علمی و ذہنی سرگرمیوں کا حصہ بنانا ضروری ہے، تا کہ حسنِ انتظام کا تملق آفریں سناٹا، پاکستانی جامعات کو قومی فکری دھارے سے بے تعلق نہ کر دے۔ بھارت کی بعض یونیورسٹیوں میں جس طرح تخلیقی فنکار کو Poet in residence کے طور پر باقاعدہ وابستہ کر کے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ادب ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے نئی نسل کے ذہنوں میں سوال پیدا کرتا رہے اور کیمپس میں تازہ خیال کے نمو اور افزائش کے لئے ایک فضا پیدا ہو سکے؛ جو کسی 'افسر' وائس چانسلر کے بس کی تو بات نہیں۔شیخ ایاز نے 'ساہیوال جیل کی ڈائری' میں بڑی تلخی سے ایک افسر کا ذکر کیا ہے کہ ''وہ [ڈپٹی کمشنر] ایک مکھی جتنا آدمی تھا، مگر قانون نے اسے اژدھے کی زبان دی تھی۔'' [ص،۹۹] اب دیکھئے ہم کسی انتظامی منصب پر فائز لاکھوں کروڑوں میں سے کسی ایک شخص کے بارے میں کہتے ہیں۔''وہ ایک انسان دوست یا پڑھا لکھا فرد ہے'' گویا افسر کا انسان دوست ہونا، یا پڑھا لکھا ہونا غیر معمولی بات ہے، جبکہ ایک دانشور، ایک تخلیق کار اور استاد اگر انسان دوست نہیں یا پڑھا لکھا، یا روشن خیال نہیں تو یہ بات تعجب انگیز اور یاس آور ہے۔پھر شیخ ایاز کی ڈائری اور یادداشتیں دیکھیں، تو ان کی وسعتِ مطالعہ ہر پڑھے لکھے کے لئے باعثِ رشک ہے، اب سوچئے کسی دانشگاہ کا وائس چانسلر ایسا شخص ہو، جو صاحبِ مطالعہ ہو، وہ ایک تاریخی، ادبی اور سیاسی موقف بھی رکھتا ہو، جو اسے پاکستان کی جمہوری اور قومی رائے عامہ میں اعتبار بھی بخشتا ہو، تو ریٹائرڈ جرنیلوں، بیوروکریٹوں یا دھڑے بند، مگر چاپلوس استادوں کے ہجوم میں سرفراز کرتا ہو، تو کس طرح اسے ایک ناکام وائس چانسلر قرار دیا جائے گا، ایاز کے نام پر میرے پاس کہنے کو کم از کم یہی ایک بات ہے جو گراں گوشوں کے لئے بآوازِ بلند کہہ دی جائے، کہ شیخ ایاز کا بطور رئیس الجامعہ تقرر، پاکستان کی فکری تاریخ کا اہم واقعہ ہے، اور اگر اسکی یاد میں اس روایت کی تجدید ممکن نہیں تو کم از کم کسی تخلیق کار کی بطور ثقافتی پروفیسر کے جامعہ میں تقرر کا اقدام تو

ہونا چاہیئے۔شاید کبھی نہ کبھی کوئی سر پھرا، وائس چانسلر یہ کر گذرے کہ اس خطے کے دانش ور یا نمایندہ تخلیق کار کو جامعہ سے وابستہ کرنا فکری فیض رسانی کا موجب سمجھے، جس خطے میں وہ جامعہ موجود ہے، کیونکہ ہر تخلیقی فن کار اپنے خطے کی تاریخ، ثقافت اور شناخت اور وہاں بسنے والوں کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔

پیچھے کون ہٹے گا یار؟

سندھ پر سر قربان ہزار

جس دم جھولی پھیلائے بھٹائی

سر دینے کو آئیں، ہزار

[وائی، ترجمہ انور ندیم علوی، 'فکرِ ایاز' ص، ۱۷۱]

ماخذات

۱۔ شیخ ایاز؛[ترجمہ، اسلم رحیل مرزا] 'دنیا ساری خواب' [آپ بیتی] الفاظ، پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء [۱۰۴ صفحات]

۲۔ شیخ ایاز؛[ترجمہ، کرن سنگھ] 'ساہیوال جیل کی ڈائری'۔ دانیال کراچی، [۲۳۲ صفحات]

۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر۔'در در ٹھوکر کھائے' فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء [۱۵۸، صفحات]

۴۔ رشید حسن خان؛[مرتب] 'زٹل نامہ'۔ انجمن ترقی اُردو، دہلی ۲۰۰۳ء، [۳۴۸ صفحات]

۵۔ آصف فرخی، شاہ محمد پیرزادہ؛[مرتب] 'فکرِ ایاز'۔ دانیال کراچی، [۳۷۵ صفحات]

۶۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر؛[مرتب] 'مقالاتِ حافظ محمود شیرانی' [جلد نہم]۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔[۶۴۶، صفحات]

۷۔ 'ادبیات'، اسلام آباد، جلد: ۱۲، شمارہ: ۴۷، بہار: ۱۹۹۹ء

۸۔ Trilling, Lionel; 'The Liberal Imagination' London 1964, [303 Pages]